R. No 2186/61

Regd. No. A. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۰ - شمارہ ۳۰ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | علی گڑھ - ۸ اگست ۱۹۶۱ء

قاضی معراج دھولپوری

گزشتہ سے پیوستہ

تبرکاتِ غالب

مذکور الصدر دونوں غزلیں صرف تخلص کے ساتھ درج ہیں۔ چنانچہ انکی نسبت اگر یہ احتمال پیدا ہو کہ "غالب" کوئی دوسرے شاعر نہ ہوں تو بیجا نہیں۔ دوسرے تذکرے تو اس وقت موجود نہیں۔ صرف "گلشن بے خار" ہی میں "اسد اللہ خاں غالب" کے علاوہ کرم الدولہ بہادر جنگ خاں متوفی ۱۲۱۵ھ خلف نیاز بیگ خاں اور غالب علی خاں نبیرہ ودودے خاں کا تخلص بھی غالب بتایا گیا ہے۔ اسی طرح میر امانی اسد مندرجہ گلشن بے خار کے ماوراء اسد تخلص دوسرے صاحب سلیمان خاں تلمیذ امیر علی "سخن" میں نظر آتے ہیں لہٰذا احتمال ہوتا ہے کہ اسد تخلص کی غزلیں کہیں ان کی نہ ہوں۔ مگر پھر بھی ان احتمالات کے باوجود دوسرا پہلو قابل درگزر نہیں کیونکہ مذکورالصدر انتخابات، اُردو دیوان غالب مطبوعہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء اور (غالب نمبر) نیز ۱۸۶۱ء (آبِ حیات) کے بعد اور مروجہ حالی دیوان کی اشاعت ۱۸۶۱ء سے پہلے کئے گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غزلیں پہلے ایڈیشن میں شامل ہوں اور دوسرے میں نہ لی جاسکی ہوں کہ وہ اور غالب کا دوسرا کلام ۱۸۵۷ء میں تلف ہو چکا تھا۔ نیز یہ بھی ممکن نہیں کہ ان ایڈیشنوں سے ماوراء مرزا کا کوئی کلام عالم وجود میں نہ ہو کیونکہ مذکورہ یادگارِ غالب "مثنوی پتنگ بازی" ہی اس کی تردید کے لئے کافی ہے کہ موجود ہوتے ہوئے پیش نظر کسی دیوان میں منقول نہیں اور نہ علیحدہ کہیں شائع ہوئی۔

نورالحسن نیر کاکوروی خلف محسن کاکوروی کی زیر ادارت ایک ماہنامہ ادیب اُردو لکھنؤ سے شائع ہوا کرتا تھا اس کے جون ۱۹۲۱ء کے رسالے صفحہ پر "غزل غیر مطبوعہ غالب" کی سرخی کے ساتھ ذیل کی عبارت اور غزل منقول ہے :-

"یہ غزل غالب نے اپنے قلم سے لکھ کر فخر الدین سخن صاحب مؤلف سروش سخن کو دی تھی۔ اصل جناب نواب سعیدالدین خاں طالب رئیس دہلی کے پاس موجود ہے":

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنالیا ہے ● یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

غزل

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالۂ کشیدہ گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ
نے دانۂ فتادہ نہ دامِ چشیدہ ہوں

جو چاہئے نہیں ہیں مری قدر و منزلت
میں یوسف بقیمتِ اول خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
ہوں میں کلامِ نغز ولے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہرچند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے میں دامن گزیدہ ہوں

ماہنامہ مذکور میں عبارت اور غزل "نواب محسن صاحب" نے چھپوائی ہے جس کی بجنسہٖ نقل پیش کردی گئی۔ اس ردیف قافئے کی دو غزلیں حمیدیہ نسخہ میں بھی درج ہیں جن کے دو دو شعر انتخاب نسخۂ نولکشوری

مسودہ میں شامل ہیں۔

ابیاتِ متفرق کے ذیل میں چند اور شعر مشمولۂ "باغِ مہر" ہیں جو متداول دیوان کی غزلوں کی زمینوں میں ہیں اور مطبوعہ اشعار کے ماورا ہیں۔ ان کے اوپر سرخی ہے "مرزا نوشہ" مرقوم ہے۔ شعر یہ ہیں ؎

مزا تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا ہم سے
وہ خود کہے کہ بتا تیری آرزو کیا ہے

جو مشتاق زُلفِ دوتا باندھتے ہیں   مرے سر سے کالی بلا باندھتے ہیں

وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا   عین جنّت میں سقر یاد آیا

پوچھے ہے کیا معاش جگر تفتگانِ عشق
جوں شمع اپنے آپ وہ خوراک ہو گئے

زمین ذیل کی غزل صرف نسخۂ حمیدیہ میں ہے ؎

حالت ترے عاشق کی یہ اب آن بنی ہے
اعضا شکنی ہو چکی اب جاں شکنی ہے

ذیل کی زمین کی غزل کسی نسخہ میں نہیں ؎

گھر سے نکلتا ہے اگر ہاں نکالیے
ناحق کی حجتیں نہ مری جاں نکالیے
لیں بوسہ یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں
اک منہ ہے کون کون سے ارماں نکالیے

ذیل کا ایک شعر بحر الفصاحت مصنفہ مولوی نجم الغنی رام پوری مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ اشاعتِ ثالث اکتوبر ۱۹۲۶ء سے ماخوذ ہے ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب (ص ۱۱۲۳)

"غالب" نامی ایک ماہنامہ آگرے سے نکلتا تھا۔ اس کی جلد اول کا نمبر ۲ و ۳ بابت ماہ جون، جولائی ۱۹۲۹ء پیشِ نظر ہے۔ اس کے صفحہ ۱۴ پر میر نذر علی درد کاکوروی کا ایک مضمون بعنوان "حضرتِ غالب اور ان کا کلام" شائع ہوا ہے جس میں تحریر ہے کہ:۔

"حضرتِ غالب نے سعدی علیہ الرحمہ کی فارسی غزل کی تضمین کی ہے جس کو اکثر قوال گایا کرتے ہیں لیکن تعجب ہے کہ وہ نہ پرانے دیوان میں ہے نہ نئے دیوان میں۔ اس لئے تضمین کا یہاں لکھنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔"

مذکورۂ بالا عبارت کے بعد ذیل کی تضمین درجِ رسالہ ہے ؎

واہ وا شرطِ محبت ہے یہی   یاد ہیں ہم سے جو وعدے تھے کبھی
خیر او پیماں شکن یوں ہی سہی   سرو سیمینا بصحرا میروی
نیک بد عہدی کہ بے ما میروی

تو جو نکلا شب کی تاریکی گئی   ہر طرف پھیلی ہے دن کی روشنی
عقل حیراں اس میں ہے جاناں مری   روئے پنہاں دارد از مردم پری
تو پری رو آشکارا می روی

دی کبھی راحت کبھی تکلیف دی   جاں بخشی کی کسی دم جان لی
جانِ جاں ہے شانِ معشوقی یہی   می نوازی بندہ را می کشی
می نشینی یک نفس یا می روی

حُسن کا تیرے ہے شہرہ کو بکو   دیدہ بازوں کا ہے میلہ چار سو
کیوں ہے پھر سیرِ چمن کی آرزو   اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

جانِ جاں طبعِ اشتہ ہے نادرست   ساتھ چلتا گر وہ ہوتا چاق و چست
تو دمِ رخصت عبث بیٹھا ہے سست   دیدۂ سعدی و دل ہمراہِ تست
تو مپنداری کہ تنہا می روی

مذکورۃ الصدر غالب سے منسوب جو تضمین درد کاکوروی نے درج مضمون کی ہے اس کے لئے مضمون نگار کوئی استناد پیش نہیں کیا۔ محض قوالوں کا گایا جانا تحقیقی دائرۂ خیال پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح "باغِ مہر" "چمن بے نظیر" اور دوسری کتابوں سے ماخوذ بعض اشعار ظاہر ظہور کمزور اور غالب کے معیارِ شاعری کے پیشِ نظر ان کے دامن پر بدنما داغ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی جہاں تک میرا خیال ہے احتیاج غور و فکر سے بے نیاز نہیں کیونکہ ہر شاعر کے کلام میں خواہ وہ کسی مقام پر فائز ہو، رطب و یابس کا ہونا قدرتی ایک بات ہے جس کا احساس مرزا غالب کو بھی یقیناً تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُن کو انتخاب کا خیال ہی کیوں پیدا ہوتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرد و گرم کو ایک مزاج بنانے کے لئے ایک نہ ایک قسم کو خیرباد کہنا ہی پڑے گا، چاہے وہ بادلِ ناخواستہ ہی کیوں نہ ہو کیونکہ شعر خواہ کسی معیار کا بھی ہو خونِ جگر سے پرورش یافتہ ہوتا ہے اور شاعر اس کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتا ہے۔ چنانچہ "نسخۂ حمیدیہ" بھی جہاں تک میں سمجھتا ہوں تکلف سے یکسر خالی نہیں۔ یہ ایک رئیس وقت کی خدمت میں پیش کیا ہوا کلام ہے جس میں بمقتضائے تہذیبِ وقت نوابانہ تزک و احتشام اور مزاج کی رعایت یقیناً ملحوظ رکھی گئی ہوگی اور پست شعروں کے اندراج سے نباضِ وقت و واقفِ نفسیات شاعر کا قلم ضرور محترز رہا ہوگا۔

بعض وقت بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر گفتگو کے درمیان میں موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے قوتِ متخیلہ پر زور دے بغیر اشعار موزوں کر کے بے تکلف صحبتوں میں سنا دیا کرتا ہے۔ جو موقع پر چسپاں اور برجستہ ہونے کی وجہ سے تیر کی طرح دل پر اثر کرتا ہے اور سننے والے اس کو ذہن یا تحریر میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ بعد کو خود شاعر بہ نظر معیار اس کو خود سے منسوب کرنا یا اپنے کلام میں شامل کرنا کسرِ شان سمجھتا ہے مگر سننے والوں کی پسند چونکہ اس پر مرکوز ہوتی ہے اس لئے وہ اس کم مرتبہ شعر کو بھی بذوق پڑھتے اور کہتے ہیں کہ یہ فلاں شاعر کا نتیجۂ فکر ہے اور اس طرح وہ اپنے کہنے والے سے سلسلہ بہ سلسلہ دور تک وابستہ رہتا ہے چنانچہ اس بیان کی تصدیق خود مرزا کے شعر مندرجہ ذیل سے بخوبی ہوتی ہے جو انھوں نے محض بچوں کے بہلانے کے لئے کہہ دیا تھا مگر وہ آج تک تاریخی حیثیت سے "آبِ حیات" میں محفوظ اور دواوین سے خارج ہے۔ شعر یہ ہے ؎

درم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

(باقی صلا پر)

اداریہ

قومی وحدت اور اُردو

ہماری آزادی کو چودہ سال ہو گئے، مگر ابھی تک ہم بعض لعنتوں سے اپنے وطن کو پاک نہیں کر سکے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی لعنت فرقہ واریت ہے۔ اسی فرقہ واریت کے کارن ملک تقسیم ہوا، اسی کی وجہ سے بڑے بڑے فسادات ہوئے اور لاکھوں آدمیوں کی زندگی برباد ہوئی۔ اسی کی وجہ سے ہماری قومی وحدت کو خطرہ ہے۔ اسی نے اقلیتوں کے ساتھ انصاف نہیں ہونے دیا۔ اسی کی وجہ سے ہماری مشترک تہذیب کے سارے عناصر کو پھلنے پھولنے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی نے اُردو کے مسئلے کو جو ایک خالص قومی مسئلہ ہے، کچھ لوگوں کی نظر میں ایک علحدگی پسندی کا سوال بنا دیا ہے حالانکہ اُردو دوست اُردو کے ساتھ انصاف اس لئے چاہتے ہیں کہ اُردو ہماری قومی زبانوں میں سے ہے اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے تو اس سے قومی وحدت اور سالمیت کو استحکام ملتا ہے۔ بعض اوقات ردِّ عمل کے طور پر اُردو کے کچھ نادان دوست اُردو کے معاملے میں سستی یا بے پروائی دیکھ کر اسے مسلمانوں سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کی فرقہ واریت ہے۔ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ کبھی تھی نہ آج ہے۔ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک سرمایہ ہے جو بقول سر تیج بہادر سپرو قطعی ناقابلِ تقسیم ہے، جس طرح ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت سے ہندوستان ہندوؤں کا ملک نہیں ہو جاتا اسی طرح اُردو اگر مسلمان زیادہ بولتے ہیں یا اسے زیادہ اپناتے ہیں تو اس کی وجہ سے اُردو مسلمانوں کی زبان نہیں ہو جاتی۔ اگر کسی حلقے کی طرف سے فرقہ واریت کا اظہار ہو تو اس سے چڑ کر ہمیں فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں سوچنا چاہئے۔ مثلاً جن سنگھ کے ایک ممبر نے اتر پردیش کی ودھان سبھا میں کہا کہ لکھنؤ میں جو ہیضہ پھیلا اس سے بڑا ہیضہ اتر پردیش کی زبان کمیٹی کی وجہ سے پھیلنے والا ہے۔ اب جن سنگھ کی مخالفت کی وجہ سے اُردو دوستوں کو ہندی کی مخالفت نہیں کرنی چاہئے یا ہندی کی ترقی اور اس کے عروج پر چراغ پا نہیں ہونا چاہئے۔ حکومت اگر ہندی کی ترقی کے لئے کوشش کر رہی ہے تو ہمیں اسے سراہنا چاہئے، کیونکہ ہندی اتر پردیش کی بڑی آبادی کی زبان ہے، ریاست کی سرکاری زبان ہے اور ۱۹۶۵ء سے یونین سرکار کی زبان ہونے والی ہے۔ ہندی کی ترقی کے لئے سرکار جو تدبیریں اختیار کرتی ہے اُن کی افادیت پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ جس قسم کی ہندی نافذ کی جا رہی ہے اُس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہئے، مگر ہندی سے ہمارا بھی رشتہ ہے اور اس لئے ہم اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ ہمیں تو اس سلسلے میں حکومت اور عوام کو یہ یاد دلانا ہے کہ ہندی کی حمایت کے معنی اُردو کی مخالفت کے نہیں، بلکہ اُردو کی ترقی سے ہندی کو بھی فائدہ پہنچنے کا امکان ہے۔ اس لئے اُردو کی ہندوستان میں ترقی کا سوال بھی قومی وحدت کے استحکام کا سوال بن جاتا ہے اور وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی متحدہ کوششوں سے ہی حل ہو سکتا ہے۔

جس طرح اُردو دوستوں کو زبان کے معاملے میں فرقہ واریت سے بلند ہونا ہے، اسی طرح ہندوستان میں جہاں بھی زبان کے سوال نے علحدگی پسندی یا انتشار کا میلان پیدا کیا ہے اس کی مخالفت کرنا ہے۔ مثلاً آسام یا پنجاب میں زبان کے سوال پر جو ہنگامہ ہوتا ہے اس میں قومی وحدت کے تصور کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور زبان کو ایک بُت بنا کر اس کی پرستش کی جاتی ہے۔ زبان کے سوال کو تہذیب کے مسئلے سے اور تہذیب کے مسئلے کو قومیت کے تصور سے علحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر آسامی کے حامی قومی وحدت کے تصور کو سامنے رکھیں تو شاید وہ بنگالی کے جائز حقوق کو تسلیم کرنے میں پس و پیش نہ کریں۔ اسی طرح ہندی کے حامی پنجاب میں پنجابی کے حقوق کو نظر انداز نہ کریں۔ اگر وہ اکثریت کے زعم میں اقلیتوں کے حقوق کو تسلیم نہیں کرتے تو قومی وحدت میں رخنہ ڈالتے ہیں اور اقلیتیں اگر اپنی شکایات کا بہانہ کر کے قومی زندگی کے دھارے سے دور ہوتی ہیں تو وہ اپنا بھی نقصان کرتی ہیں اور ملک کی ترقی میں بھی روڑے اٹکاتی ہیں، جس طرح ایک فرد کو اپنی تندرستی کی برابر حفاظت کرنا پڑتی ہے، اسی طرح ایک قوم کو اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کے لئے برابر چوکس رہنا پڑتا ہے۔ یہ فرض اکثریت ہو یا اقلیت سبھی پر عاید ہوتا ہے۔ ہندوستان کی نجات اسی میں ہے کہ سب قومیت کے سہارے، جمہوریت کی تعمیر میں لگے رہیں، ریاست کے غیر مذہبی تصور کو اپنائیں اور سوشلزم کی منزل کی طرف گامزن ہوں۔ اُردو دوست اس مقدس مشن میں اپنا رول اسی طرح ادا کر سکتے ہیں کہ اُردو کے مسئلے کو قومی نقطۂ نظر سے سمجھیں اور سمجھائیں اور علحدگی پسندی یا انتشار کا شکار نہ ہوں اور دوسری زبانوں کے معاملے میں بھی قومی نقطۂ نظر سے سوچیں اور عمل کریں۔ یہ وقت ایک دوسرے پر الزام دھرنے کا نہیں ہے، ذہنوں کو صاف رکھنے اور قوموں کو سیدھے راستے پر گامزن رکھنے کا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن نے اُردو کی جو تحریک چلائی ہے وہ شروع سے قومی نقطۂ نظر کی حامل رہی ہے۔ فرقہ پرستوں نے اس پر اعتراضات کئے ہیں، مگر ہمیں ان اعتراضات کی پروا نہیں۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ اپنی منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔

اِدھر اُدھر سے

انگریزی زبان کے نئے رسم الخط کی ایجاد

معلوم ہوا ہے کہ لندن میں اس سال ستمبر کے مہینے میں ایک ہزار بچّوں کو جن کی عمریں پانچ سال ہوں گی انگریزی زبان کے نئے حروف تہجّی میں تعلیم دی جائے گی۔ اس سلسلے میں ایک اعلان بھی کیا گیا ہے کہ سر دست اس مقصد کے لئے چھ میں اسکولوں نے یہ مان لیا ہے کہ وہ تین سال تک تجربے کے طور پر نئے رسم الخط کے کورس جاری کریں گے اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ نتائج کے لحاظ سے نئے حروف تہجّی مفید ہیں یا پرانے حروف تہجّی۔

نئے حروف تہجّی سر آئزک پٹ مین ایم پی نے ایجاد کئے ہیں جو "شارٹ ہینڈ" کے موجد کے پوتے ہیں۔

نئے رسم الخط میں موجودہ حروف تہجّی میں سے اکثر حروف شامل رہیں گے، مگر ان میں انیس کا اور اضافہ کر دیا جائے گا، اس رسم الخط میں کیپیٹل (بڑے) حروف نہیں ہوں گے، اور الفاظ کے ہجّوں کا انحصار تلفظ پر ہوگا۔

جن ایک ہزار بچّوں کو جدید حروف میں تعلیم دی جائے گی ان کے لئے کتابیں بھی انہی حروف میں چھپوائی جائیں گی۔ جب یہ بچّے سات سال کے ہو جائیں گے تو انھیں پرانے حروف تہجّی کی لکھائی بھی دی جائے گی۔

اس رسم الخط کی ترویج کا مقصد یہ ہے کہ بچّوں کو جلدی لکھنا پڑھنا آ جائے گا۔ اگر کسی بچّے کے والدین کو نئے رسم الخط پر اعتراض ہوگا تو اسے اس میں تعلیم نہیں دی جائے گی اور کسی ایسے اسکول میں داخل کرا دیا جائے گا جہاں مروج حروف تہجّی میں تعلیم دی جاتی ہے اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو پھر سب اسکولوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے گا کہ وہ نئے طریقے کو اپنائیں۔

بچّوں کے لئے ٹیگور کی ہندی سوانح حیات

نئی دہلی۔ ۱۷ر جولائی، ٹیگور کے صد سالہ جشن کے سلسلے میں اسکول کے طلبہ و طالبات کے لئے ساہتیہ اکیڈیمی نے ٹیگور کے سوانح حیات کو ہندی زبان میں ایک مختصر سی سو صفحات والی کتاب کی شکل میں شایع کیا ہے۔ اصل کتاب شریمتی لیلا مجمدار نے جو کہ بنگلہ زبان میں بچّوں کی کئی ایک کتابوں کی مصنف ہیں بنگالی میں لکھی تھی۔ اس کتاب میں شگفتہ انداز میں بچّوں کو ٹیگور کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرایا گیا ہے اس کا ہندی ترجمہ شری پرتھوی جیت نوال پوری نے کیا ہے۔ کتاب کے سرورق پر ٹیگور کی ایک دیدہ زیب تصویر اور کتاب کے ختم پر شاعر کے قلم سے لکھی ہوئی ان کی مشہور نظم کا عکس ہے۔ انگریزی زبان میں کتاب کا نام "ہمارا شاعر" اور ہندی اور دوسری ہندستانی زبانوں کو کوئی "ہمارا شاعر" رکھا گیا ہے۔ کتاب کی قیمت برائے نام ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لڑکے خرید سکیں۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی عنقریب شایع ہوگا۔

ہندی کی ٹیکنیکل اصطلاحات

مرکزی سرکار نے فوری طور پر ہندی کی سائنٹفک اور ٹیکنیکل اصطلاحات وضع کرنے والا ایک مستقل کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری چیرمین گرانٹس کمیشن ہوں گے۔

ہیڈ کوارٹر نئی دہلی میں ہوگا۔ اور چیرمین کے علاوہ چھ دیگر ممبران ہوں گے۔ کمیشن کے کاموں میں حسب ذیل کام شامل ہوگا۔ اب تک اس میدان میں جو کام لیا گیا ہے اس کا جائزہ لینا اور ہندی اور دوسری بھاشاؤں کے لئے ٹیکنیکل اصطلاحات کے اصول قرار دینا ہندی اور دوسری زبانوں میں اصطلاحات کی فرہنگیں تیار کرانا اور مستند سائنٹفک نصابی کتابیں، کرانا اور ڈکشنریاں اور ترجمے وغیرہ کرانا۔

اُردو کی قومیت

سنسکرت	اُردو
بَ نْ دْ ھ	باندھنا
پ سْ شْ	پیس نا
تَ نْ	تان نا
جاگْ رِ	جاگ نا
چَ وْ رْ	چوری کرنا
چل	چل نا
دَ نْ تْ	دانت
دُ ہ	دُوہ نا
سَ رْ وْ	سب
شَ کْ	سک نا
کْ رِی	کرنا
گَ وْ	گائے

(اقبال کرشن)

ٹیگور کی سوانح حیات پر اُردو میں بہترین کتاب

صد سالہ جشن ٹیگور کمیٹی اندھرا پردیش کے سکریٹری ڈی راما نج راؤ رکن پارلیمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ رابندرناتھ ٹیگور کی سوانح حیات پر اُردو زبان میں بہترین کتاب لکھنے پر وزیر حسن دہلوی کو دو ہزار دو سو بتیس (۲۲۳۲) روپے کا نقد انعام دیا گیا ہے۔

پریم چند یادگاری فنڈ حکومت کا ۲۵ ہزار کا عطیہ

معلوم ہوا ہے کہ مرکزی وزارت ثقافت نے پریم چند یادگاری فنڈ میں ۲۵ ہزار روپیہ چندہ دیا ہے۔ یہ فنڈ کاشی ناگری پرچارنی سبھا نے اس لئے قائم کیا ہے کہ اس کا روپیہ اُردو اور ہندی کے ممتاز مصنف کے نام پر ایک یادگار قائم کرنے میں استعمال کیا جائے گا یادگار منشی پریم چند کے وطن میں قائم کی جائیگی جو بنارس سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔

راہی معصوم رضا

یاد

یاد کیا ہے
اک نشانِ زخم،
یا اک رہ گذر ہے
خواب کے نقشِ قدم پر
درد کے نقشِ قدم ہیں
وقت کے چنچل بگولے
چیختے ہیں
ناچتے ہیں
بھاگتے ہیں
رفتہ رفتہ
ذرہ ذرہ
خواب کے نقشِ قدم بھی
درد کے نقشِ قدم بھی
وقت کے اس بے کراں صحرا میں جا کر
ساتھ ان چنچل بگولوں کے کہیں پہ
تھک کے گر جاتے ہیں شاید
گر کے مر جاتے ہیں شاید
کون اس کی جستجو میں
وقت کے اس بے کراں صحرا میں جائے

میر حسین علی افسر

غزل

چاک داماں بھی نہیں چاک گریباں بھی نہیں
وہ جنوں ہے کہ جنوں کا کوئی ساماں بھی نہیں

بیخودیٔ شوق کی لے آئی ہے کس منزل پہ
ہجر کا غم بھی نہیں وصل کا ارماں بھی نہیں

وائے قسمت ہے اسی شوخ کا سودا دل کو
جس کے ملنے کا بظاہر کوئی امکاں بھی نہیں

ایک بے نام خلش رہتی ہے اب بھی اے دوست
اور دل ترکِ تعلق سے پشیماں بھی نہیں

نہ توجہ ہی ہے ان کی نہ تغافل افسوس
کوئی جینے کا ہمارے لئے ساماں بھی نہیں

دورِ دیوانگیٔ شوق تھا اپنے دم سے
آج زنداں میں کوئی شورشِ زنداں بھی نہیں

تو نے در کھول تو رکھا ہے قفس کا صیاد
یاد اب مجھ کو مگر میرا گلستاں بھی نہیں

ہائے کچھ اور سلجھتے ہیں اُلجھ جانے میں
گیسوئے یار پریشاں ہیں پریشاں بھی نہیں

یوں تو کہنے کو سب اپنے ہیں جہاں میں افسر
جس کو اپنا کہیں ایسا کوئی انساں بھی نہیں

آفتاب شمسی

غزل

جب کبھی پایا اُنھیں نغمہ بلب، ساغر بکف
چھٹ گیا ابرِ الم دل بن گیا اُن کا ہدف

کیا خبر تھی سیرِ گلشن گل کھلائے گی نیا
ہم تو یونہی دل کو بہلانے گئے تھے اُس طرف

اس غلط فہمی کا پچھتاوا رہے گا عمر بھر
جس کو سمجھا گوہرِ نایاب وہ نکلا خذف

شب کی تاریکی میں جب بھی آ گیا اُن کا خیال
یوں لگا جیسے وہ خود ہی آ گئے مشعل بکف

سنگ ریزے جان کر ان کو حقارت سے نہ دیکھ
کون جانے ان خذف ریزوں میں کتنے ہیں صدف

شب ڈھلے کل شیخ جی کو میکدے میں دیکھ کر
رند بولے یک زباں ہو کر ارے آپ اِس طرف

ناصحِ ناداں کو شمسی کس طرح سمجھاؤں میں
کاش وہ خود دیکھتا اُن کو کبھی ساغر بکف

عتیق انجمی

غزل

جب تک ہم آشنائے غمِ دو جہاں نہ تھے
یوں مبتلائے کشمکشِ این و آں نہ تھے

ہم تجھ سے بے نیاز تو اے جانِ جاں نہ تھے
یہ اور بات ہے کہ ترے راز داں نہ تھے

ہم تجھ سے مل کے بھی ہیں بہت شادماں مگر
تجھ سے ملے بغیر بھی ناشادماں نہ تھے

اس طرح بدگمان ہو، اللہ کی پناہ
تم مجھ پہ گویا پہلے کبھی مہرباں نہ تھے

ان مرحلوں سے پھر بھی گذرنا پڑا ہمیں
گو خوگرِ کشاکشِ سود و زیاں نہ تھے

کیا تم نے زندگی کی تمنا نہیں کی
مانا کہ زندگی کے "حسیں ترجماں نہ تھے"

وہ غم جو میری ذات سے منسوب تھے عتیق
کیا درد کشِ حدیثِ غمِ دیگراں نہ تھے

بیگم ممتاز مرزا

غزل

ہلاکِ محبت، قتیلِ زمانہ
بہت دکھ بھرا ہے ہمارا فسانہ

نہ پوچھو ہمیں کیا ملا ان کے در سے
غمِ جاودانہ، غمِ جاودانہ

کہاں کا حرم کیسے دیر و کلیسا
جبیں کو بہت ہے ترا آستانہ

کوئی تو بتائے کہ کیسے جئیں گے
تغافل قیامت، کرم تازیانہ

گلستاں میں شورش ہے برقِ بلا کی
مرا آشیانا، مرا آشیانہ

ہر اک گل کے پہلو میں کانٹے چھپے ہیں
فریبِ زمانہ، فریبِ زمانہ

الٰہی نہ جاگیں ستاروں کی نیندیں
سناتے ہیں ہم آج اپنا فسانہ

مراسلات

مثنوی گل بکاولی کے اشعار

۱۵ر جولائی ۱۹۶۱ء کے "ہماری زبان" میں محترمی سید مسعود حسن رضوی صاحب نے گل بکاولی کے قصے سے متعلق چند اشعار کے بارے میں استفسار کیا ہے کہ یہ کس مثنوی کے ہیں۔ میں ان اشعار کی بحر دیکھ کر کھٹکا کیونکہ اس بحر میں گل بکاولی کی کوئی مشہور مثنوی نہیں ہے۔ خیال ہوا کہ ایسا تو نہیں کہ نہال چند لاہوری کی "مذہبِ عشق" میں نثر کے درمیان یہ اشعار شامل ہوں۔ مذہبِ عشق نکال کر دیکھی تو اس میں ص ۲۵ پر محولہ اشعار مل گئے لیکن بعض اشعار کا متن کچھ مختلف تھا۔ میرے پاس جو ایڈیشن ہے وہ لاہور کا شائع شدہ ایڈیشن ہے۔ تاریخ طباعت درج نہیں۔ متن کے اختلافات کی تفصیل یہ ہے۔

رضوی صاحب کی بیاض میں	مذہبِ عشق میں
قبول اس نے کیا جلنا سدا کا	قبول اس نے کیا جلنا سدا کا
نہ چھوڑا وصل ہرگز دل ربا کا	نہ چھوڑا وصل لیکن دل ربا کا
سر اپنے کو وہ ہر شب جلاتی	جلاتی تھی تنِ نازک کو ہر شب
سدا تن کو وہ خاکستر بناتی	نہ کھلتے تھے شکایت کو کبھی لب
فراق اس کا نہ تھا ہرگز گوارا	وہ عاشق سے نہ تھی کرتی کنارا
یہ عاشق سے نہ کرتی وہ کنارا	فراق اس کا نہ تھا ہرگز گوارا
	جو جلنا مرنا اپنے جی میں ٹھانے
	وہ ہر آتش کدہ کو آب جانے
گوارا تن پہ ہوئے نارِ سوزاں	گوارا ہوتی ہے سب نارِ سوزاں
سہا جاتا نہیں پر داغِ ہجراں	سہا جاتا نہیں پر سوزِ ہجراں
جسے ہو شمع رویوں کی محبت	جسے ہو شمع رووں کی محبت
وہی جانے ہے تن جلنے کی لذت	اسی سے پوچھئے جلنے کی لذت

ظاہر ہے کہ مذہبِ عشق کے اشعار عام طور پر بیاض کے اشعار سے بہتر ہیں۔

(گیان چند۔ بھوپال)

[ڈاکٹر گیان چند کا مراسلہ منظر حسن دسنوی کے مراسلے سے پہلے موصول ہوا تھا ——— (ادارہ)]

"ابیاتِ بکاولی"

۱۵ر جولائی ۱۹۶۱ء کے "ہماری زبان" میں جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک مراسلہ بعنوان "یہ شعر کس مثنوی کے ہیں" شائع ہوا جس میں انھوں نے "ابیات بکاولی" کے زیرِ عنوان پانچ اشعار درج کئے ہیں جو انھیں کسی بیاض میں ملے اور دریافت فرمایا ہے کہ یہ اشعار کس مثنوی کے ہیں؟ اور مصنف کا نام کیا ہے۔ تو عرض ہے کہ جان گل کرسٹ صاحب کے حکم کے مطابق منشی نہال چند دہلوی (ثم لاہوری) نے فارسی گل بکاولی سے "تاج الملوک اور گل بکاولی" کا قصہ اردو زبان میں ترجمہ کیا اور اس کتاب کا نام "مذہبِ عشق" رکھا یہ کتاب میر شیر علی افسوس کی نظر ثانی کے بعد پہلی بار ۱۸۰۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے اکیسویں قصے میں بکاولی کے راجہ اندر کی سبھا میں جانے اور ناچنے کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں چھ اشعار درج ہیں یعنی ادیب صاحب کے لکھے ہوئے پانچ اشعار سے ایک زیادہ۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں کتاب مذکور میں "ہرگز" کی جگہ "لیکن" ہے۔ دوسرا شعر بالکل وہی ہے جو ادیب صاحب نے لکھا ہے۔ تیسرے شعر کے مصرعوں میں الٹ پھیر ہے یعنی اس کتاب میں شعر یوں ہے:-

یہ عاشق سے نہ کرتی تھی کنارا ● فراق اس کا نہ تھا ہرگز گوارا

چوتھا شعر جو ادیب صاحب کی بیاض میں نہیں ہے وہ یہ ہے:-

جو جل مرنے کو اپنے جی میں ٹھانے ● وہ ہر آتشکدے کو آب جانے

پانچویں شعر میں "داغِ ہجراں" کی جگہ "سوزِ ہجراں" ہے۔

راقم کے پاس جو کتاب ہے اس کا سنہ اشاعت ۱۲۶۳ھ ہے اور مطبوعہ احمدی پریس کلکتہ ہے۔ (سید منظر حسن دسنوی)

اقبالؒ کا ایک منظوم خط

۸ر اپریل کے "ہماری زبان" میں علامہ اقبالؒ کے "خطِ منظوم" کے متعلق جناب نامؔ سیتاپوری کی رائے بہت صحیح ہے۔ مخزن اور عالمگیر کے علاوہ بھی یہ نظم سرودِ رفتہ میں شائع ہو چکی ہے۔

اس کے چالیس شعر تھے۔ نظر ثانی میں ستائیس حذف ہو گئے تھے صرف تیرہ "عقل و دل" کے عنوان سے بانگِ درا (ص ۲۰) میں شائع ہوئے تھے۔ بقیہ ستائیس حذف شدہ اشعار سرودِ رفتہ (ص ۱۰۳) مرتبہ مولوی غلام رسول مہر و مولوی صادق علی دلاوری میں ۱۹۵۹ء میں شائع ہو گئے ہیں۔

سرودِ رفتہ میں حضرت علامہ اقبال کا وہ کلام جو ان کے ترتیب دئے ہوئے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا تھا جمع کر دیا گیا ہے۔

(محمد بشیر الحق دسنوی بہاری)

دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) کی اشاعت کا سال

نسخۂ حمیدیہ کے جو نسخے عام طور پر دستیاب ہوتے ہیں، ان میں سے کسی ایک میں بھی سنہ طباعت موجود نہیں۔ اس کی وجہ سے غالب پر کام کرنے والوں کو بعض اوقات زحمت بھی پیش آتی ہے۔

آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں اس ایڈیشن کی ایک کاپی کے سرورق پر حسب ذیل عبارت چھپی ہے:-

"مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں محمد قادر علی خاں صوفی کے اہتمام سے چھپا"

اس عبارت میں تقریباً اسٹیم پریس کے اوپر خفی خط میں "۱۹۲۱ء" لکھا ہوا ہے۔ نیز اس سطر کے نیچے لکھا ہے:-

قیمت مجلد ہے مسطر امرد ہوی کتابت نمود قیمت غیر مجلد ۱۲/

اس صراحت کے بعد شبہ نہیں رہتا کہ نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا تھا، نیز معلوم ہوتا ہے کہ پھر کسی وجہ سے (جو قیمت کا معاملہ ہو سکتا ہے) دوسرا سرورق آگرے ہی میں چھپوایا گیا۔ اس میں طبع اور قیمت کا اظہار ان لفظوں میں ہوا:-

"مفید عام اسٹیم پریس آگرہ میں باہتمام محمد قادر علی خاں صوفی طبع ہوا۔" قیمت مجلد صر مسطر امرد ہوی تحریر نمود قیمت غیر مجلد للعہ

اس سرورق کے بعد پھر ضرورت ہوئی کہ کچھ اور کاپیاں سرورق کی نکلوائی جائیں۔ اب یہ کام بھوپال میں ہوا اور عبارت یوں لکھی گئی:-

"صرف ٹائیٹل گورنمنٹ پریس بھوپال میں طبع ہوا"

قیمت مجلد صر (کتب نصیر الدین) غیر مجلد للعہ

ان دونوں سرورقوں کے ساتھ سنہ طباعت نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ دونوں ۱۹۲۱ء کے بعد تیار کرائے گئے تھے اگر ان کے ساتھ ۱۹۲۱ء لکھتے تو غلط ہوتا، اور دوسرا سنہ لکھتے تو شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ سنہ اصل نسخے کی طباعت کا ہے اور یہ لکھنا کسی وجہ سے مناسب نہ جانا کہ صرف سرورق فلاں سنہ میں چھاپا گیا۔

یہ تصریح نامناسب نہ ہوگی کہ آخری دونوں سرورق کے نسخے رضا لائبریری میں بھی موجود ہیں۔

(امتیاز علی عرشی)

جیتا جاگتا کا پبلشر

[ہماری ۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء کے ہماری زبان میں "جیتا جاگتا" (مصنف ابن طفیل۔ مترجم ڈاکٹر سید محمد یوسف) پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس میں پبلشر کا نام نہ دیا جا سکا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اردو (پاکستان) نے شائع کی ہے۔ ادارہ]

دوسری زبانوں کے الفاظ کا تلفظ

اقبال کرشن صاحب کا (دعا ذ ہماری زبان یکم جولائی) بالکل درست ہے کہ کسی دوسری زبان کا لفظ اردو میں لکھتے وقت اسی زبان کا تلفظ اپنانا چاہیے۔ آخر انگریزی کی پیروی کب تک؟ خاص طور پر فرانسیسی زبان کے نام انگریزی رسم الخط کی بہ نسبت اردو میں زیادہ صحت سے لکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں ایک سے زیادہ مقامی اردو اخبارات کو توجہ دلائی مگر یہ اقدام نتیجہ خیز نہ ثابت ہوا۔

چنانچہ 'ڈیگول' کو 'ڈیگال'۔ 'ٹراکلین (کینڈی)' کو 'جیکولا ین'۔ 'کوکلا توں' کو 'کا کہاٹ ذیل' عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ اسی قسم کی سیکڑوں غلطیاں ہوتی ہیں جن کا مستقل تدارک تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام جو لغت مرتب کی جا رہی ہے اس میں آخر میں بیرونی ناموں اور ان کے اردو تلفظ کی فہرست شامل کی جائے جیسا کہ انگریزی کی معیاری ڈکشنریوں میں ہوتا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک مستقل کام ہے جس کے لئے خاصا وقت اور محنت درکار ہے۔ اس دوران میں اخبارات و رسائل، ان ممالک کی میڈیو نشریات سے استفادہ کر سکتے ہیں جہاں کی زبان کے ناموں کا صحیح تلفظ مطلوب ہو۔

برسبیل تذکرہ کرشن صاحب نے فرانسیسی 'AU' کا تلفظ 'اُو' لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ 'AU' اور 'EAU' کا تلفظ 'اَو' ہے۔ البتہ 'OU' کا تلفظ 'اُو' ہے جیسے JOURNAL "ژورنال" بمعنی روزنامہ۔ (واجد نعیم الدین۔ حیدرآباد)

ابوالکلام آزاد کی کتاب تذکرہ

مولانا ابوالکلام کی کتاب تذکرہ کی اشاعت اول کا نام وغیرہ سرورق میں اس طرح درج ہے "فضل الدین احمد مرزا بی۔ ایس۔ سی۔ ای۔ ایم۔ ایف۔ جی۔ ایس (یوکو)" اس کتاب کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ۵۰ صفحات سے زیادہ (ایک جگہ چھ سات سو صفحوں سے زیادہ) میں خاندانی حالات لکھ کر انہیں بھیجے اور اپنے حالات میں صرف ایک فصل تحریر کی جو کتاب کے آخر میں درج ہے۔ فضل الدین احمد مرزا صاحب ۱۹۱۶ء میں چھ ماہ رانچی میں مقیم رہے اور ان کے حالات پوچھ پوچھ کر لکھتے رہے۔ خود مولانا نے صفحہ ۲۳ میں لکھا ہے کہ مجدد الف ثانی کی سیرت متوسط تقطیع کے ۱۶۲ صفحوں میں تمام ہوئی اور فضل الدین احمد مرزا کے حوالے کی گئی۔

میں نہایت ممنون ہوں گا اگر جناب مرتب یا کوئی اور صاحب سوالات ذیل کے جواب عنایت فرمائیں گے۔

(۱) ای۔ ایم۔ ایف۔ جی۔ ایس (یوکو) سے کیا مراد ہے؟

(۲) تذکرہ کی جلد اول (اور صرف یہی شائع ہوئی ہے) ۳۰۰ صفحات سے کچھ زیادہ کی ہے۔ اس کے باقی اوراق کہاں ہیں؟

(۳) سیرت مجدد الف ثانی کہاں ہے؟

(۴) مرتب نے جو حالات لکھے تھے کیا ہوئے؟

(سید ظہیر احسن)

انجمن کا خبرنامہ

چھتیس گڑھ اُردو کانفرنس

۱۰، ۱۱ر جون سنہ ۱۹۷۱ عیسوی کو شاخ بلاسپور کے زیر اہتمام چھتیس گڑھ اُردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں رائے پور، رائے گڑھ، امبکاپور، جھرسگڑا اور بلاسپور کے نمائندوں نے شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت قاری محمد عثمان صاحب نے کی۔ کانفرنس کی کارروائی تلاوت قرآن سے شروع ہوئی۔ محمد اسحاق صاحب اور حاجی منیر احمد خاں صاحب کے انتقال پر تعزیتی تجاویز پاس کی گئیں۔ کانفرنس نے جن اہم مسائل پر غور کیا اور تجاویز پاس کیں ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ کانفرنس میں ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکول رائے پور کے منتظمین، بلاسپور اور رائے پور کی میونسپل کمیٹیوں کے اس فیصلے پر کہ ان کے زیر انتظام اسکولوں میں اُردو کو بحیثیت ایک مضمون برقرار نہ رکھا جائے، جبکہ پڑھانے کے لئے لائق اساتذہ اور پڑھنے کے لئے طلبہ کی بڑی تعداد موجود ہے، افسوس کا اظہار کیا اور اس اہم مسئلہ کی طرف مرکزی حکومت اور ریاستی حکومت، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مدھیہ پردیش، صدر آل انڈیا کانگریس کمیٹی، صدر کمیٹی قومی اتحاد اور لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو متوجہ کیا اور اس بات پر زور دیا کہ حکومت مدھیہ پردیش مذکورہ افراد اور کمیٹیوں کو ہدایت دے کہ وہ اُردو نصاب کا انتظام کریں جیسا کہ مہاراشٹر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کا ہے اور اگر وہ حکومت کے احکامات پر عمل نہ کریں تو حکومت ان کو دی جانے والی سرکاری امداد بند کر دے۔

۲۔ کانفرنس میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا گیا جنھوں نے کاٹ گھوڑا، رتن پور، اکل تارا، چمپا، جینڈرا، اروڑا، سکتی اور منگیلی میں اُردو پرائمری اسکولوں کے قیام کی تحریک کی اور اسے عملی جامہ پہنایا، اور حکومت مدھیہ پردیش سے درخواست کی کہ وہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کو ہدایت دے کہ وہ ان اسکولوں کا معائنہ کریں اور تعلیمی محکمہ کے میمورنڈم نمبرہ 31 — x x/43/9 مورخہ ۱۵ر مارچ سنہ ۱۹۶۱ء کے مطابق ان اسکولوں کو سرکاری طور پر تسلیم کرے تاکہ آئندہ ان کو مالی مشکلات نہ پیش آئیں۔ کانفرنس نے یہ بھی تجویز کیا کہ اس علاقہ میں مزید اسکولوں کے قیام کے لئے جدوجہد کی جائے۔

۳۔ کانفرنس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ حکومت مدھیہ پردیش اُردو پرائمری اسکولوں کے معائنہ کے اور پانچویں درجہ کے طلبہ کے امتحانات کے انتظام کے لئے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولس کو ہدایت دے، جو اُردو کی اچھی استعداد رکھتے ہیں، کیونکہ امسال اُردو داں طلبہ کو پرچوں کے صحیح ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مشکلات پیش آئیں۔ انجمن ترقی اُردو بلاسپور کو موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس کی وجہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کی اُردو سے عدم واقفیت تھی۔ کانفرنس امید کرتی ہے کہ افسران کی اس بے پرائی سے اردو داں طلبہ کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کسی نہ کسی طرح تلافی کی جائے گی۔

۴۔ کانفرنس میں یہ تجویز پاس کی گئی کہ عالی جناب جگجیون رام وزیر ریلوے کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ ریاست کے اسکولوں کے معائنہ کرنے والے افسران کی بار بار یاد دہانی اور سفارش کے باوجود جنوب مشرقی ریلوے بلاسپور کے کنٹرولنگ آفیسر مشترکہ اُردو پرائمری اسکول میں ایک مزید استاد کے تقرر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اسکول کی ۵ جماعتوں کو تعلیم دینے کے لئے اس وقت صرف تین استاد ہیں جو ہر اعتبار سے ناکافی ہیں۔ موجودہ ہندی پرائمری اسکول کی عمارت اردو پرائمری اسکول کے لئے تھی۔ کنٹرولنگ آفیسر نے اس عمارت کو اردو پرائمری اسکول سے لے لیا اور مشترکہ اُردو پرائمری اسکول صرف صبح کے اوقات تک محدود کر دیا، اس طرح اُردو پرائمری اسکول کی ضروریات کو نظر انداز کیا گیا جس سے طلبہ کی تعلیم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ کانفرنس وزیر ریلوے سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ہندی اسکول، ہندی پرائمری اسکول اور انگریزی مڈل اسکول کی علٰحدہ عمارتوں کی تعمیر کے لئے احکامات جاری کریں تاکہ موجودہ عمارت، جو اُردو پرائمری اسکول کے لئے بنائی گئی تھی، اردو پرائمری اسکول کو مل جائے۔ اور اس وقت تک جب تک مذکورہ نئی عمارتیں تعمیر ہوں، اُردو پرائمری اسکول کو دن میں کھلنے کی سہولتیں فراہم کی جائیں، تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

۵۔ یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ موجودہ اُسعد مراٹھی نارمل اسکول بلاسپور کو بیسک ٹریننگ کالج میں تبدیل کر دیا جائے، اور اس کے لئے لکچررس کا تقرر کیا جائے کیونکہ یہاں خواتین کے لئے کوئی علٰحدہ ادارہ نہیں ہے۔ اس لئے کانفرنس یہ بھی تجویز کرتی ہے کہ ٹریننگ کالج کے اساتذہ میں پچاس (۵۰) فی صدی خواتین ہوں۔

۶۔ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ ریاستی حکومت ڈویزنل سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن ہوشنگ آباد کو ہدایت دے کہ وہ تمام مدھیہ پردیش کے، خاص طور سے چھتیس گڑھ کے طلبہ کو نارمل اسکول میں داخلے کی زیادہ سہولتیں دیں تاکہ اس علاقے میں تربیت یافتہ اُردو اساتذہ کی ضرورت پوری ہو سکے۔

کانفرنس نے مندرجہ بالا مسائل پر غور کرنے اور تجاویز پاس کرنے کے بعد حاجی ابراہیم بھائی (رائے پور)، بشیر احمد قریشی (بلاسپور)، حاجی عبد الکریم (رائے پور)، کے۔ جی۔ انصاری (بلاسپور) اور ضیاء الدین صاحب (بلاسپور) کی اُردو سے محبت، اردو کے لئے جدوجہد کرنے کے جذبے اور انجمن ترقی اردو چھتیس گڑھ سے پرخلوص تعاون کو سراہا اور شکریہ ادا کیا۔

(محمد عبد المبین - کنوینر)

لسانی کمیٹی اتر پردیش کا سوال نامہ

حکومت یو۔پی کی مقرر کردہ لسانی کمیٹی کی طرف سے اردو زبان کے سلسلے میں ایک سوالنامہ جاری کیا گیا ہے جس میں اتر پردیش میں اردو کی حیثیت کا جائزہ لینے اور اُردو کو مناسب جگہ دینے سے متعلق سوالات پوچھے گئے ہیں۔

یہ سوال نامہ کمیٹی کی طرف سے بڑی تعداد میں اردو اور ہندی سے دلچسپی رکھنے والوں کے پاس بھیجا جانے والا ہے۔ اس کی نقلیں لسانی کمیٹی کے دفتر و ضلع کونسل ہاؤس لکھنؤ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

یہ سوال نامہ حسب ذیل پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حصہ اوّل تعلیم

۱۔ ان بچوں کو جن کی مادری زبان اُردو بتائی گئی ہے تعلیم کے ابتدائی دور میں اردو میں تعلیم دینے کا انتظام۔

(الف) کیا یہ انتظام اطمینان بخش ہے؟

(ب) کیا آپ کوئی سجھاؤ دینا چاہتے ہیں؟

۲۔ جونیر بیسک اسکول سے درجہ ۵ پاس کرنے والا بچہ جسے اردو میں تعلیم دی جاتی ہے سینئر بیسک اسکول کے درجہ ۶ میں دی جانے والی تعلیم کو کس حد تک سمجھ سکتا ہے جس میں تمام مضامین ہندی میں پڑھائے جاتے ہیں؟

۳۔ ان طالب علموں کو جن کی مادری زبان اردو ہے تعلیم کے ثانوی دور میں اُردو میں تعلیم دینے کا موجودہ انتظام۔

(الف) کیا یہ انتظام اطمینان بخش ہے؟

(ب) کیا آپ کوئی سجھاؤ دینا چاہتے ہیں؟

۴۔ کیا آپ کی جانکاری میں کوئی ایسی خاص مثال ہے کہ ہائر سکنڈری اسکولوں میں داخلہ اور اردو کو ایک مضمون کے طور پر پڑھنا چاہنے والے طالب علموں کو مشکل پیش آئی؟

۵۔ کیا ثانوی دور میں اردو کے ذریعہ سے تعلیم دینے والے کسی ادارہ کو تعلیم (Recognition) کے حصول کی شرطیں پوری کرنے پر بھی تعلیم کے حصول میں کوئی دشواری ہوئی؟

۶۔ کیا سرکار کی ہدایتوں کے بموجب تعلیم کے ابتدائی اور ثانوی دور میں اُردو پڑھانے کے لئے ٹیچر مہیا کرنے میں کوئی دشواری ہوئی؟

براہ مہربانی ایسی مثالیں دیجئے جو آپ کی جانکاری میں ہوں۔

۷۔ کیا آپ کی جانکاری میں ان جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں میں جہاں ۱/۳ یا ۱/۱۰ سے زیادہ طالب علموں نے اُردو کو اختیاری مضمون کے طور پر لیا ہو اردو پڑھانے کا انتظام کرنے میں کوئی دشواری ہوئی؟

۸۔ کیا آپ کی جانکاری میں ایسی مثالیں ہیں کہ گورنمنٹ کو ہائی اسکولوں کے لئے اردو کی اہلیت رکھنے والے (Qualified) ٹیچروں کی خدمات حاصل کرنے میں اس لئے دشواری ہوئی کہ ایسے ٹیچر نہیں ملتے تھے؟

۹۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ تمام درجوں کے لئے ضرورت کے مطابق اردو کی ٹیکسٹ بکیں نہیں ملتیں؟

۱۰۔ کیا آپ کی جانکاری میں کسی ایسے طالب علم کو جس نے بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق ہائی اسکول کے امتحان میں سوالوں کے جواب اردو میں دینے کی خواہش کی ہو کوئی دشواری ہوئی؟

۱۱۔ کیا اُردو زبان کے علاوہ دوسرے مضمونوں کی تعلیم اسی زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے سہولتیں ضروری ہیں؟

۱۲۔ کیا سکنڈری اسکولوں میں اُردو کے ذریعے سے دوسرے مضمون پڑھانے کی سہولتیں ہیں؟

حصہ دوم نظم و نسق (Administration)

۱۳۔ کیا آپ کی جانکاری میں اُردو میں لکھی ہوئی درخواستوں کے عدالتوں میں لئے جانے سے متعلق سرکاری ہدایتوں کے نفاذ میں کوئی دشواری ہوئی؟

۱۴۔ کیا آپ کی جانکاری میں اُردو دستاویزوں کو عدالتوں میں پیش کرنے کے بارے میں کوئی دشواری ہوئی؟

۱۵۔ کیا آپ کی جانکاری میں سرکاری ہدایتوں کے بموجب رجسٹرار کے دفتر میں اردو دستاویزوں کی رجسٹری کرانے میں کوئی دشواری ہوئی؟ اگر ہوئی تو کیا آپ اس بارے میں کوئی سجھاؤ دیں گے؟

حصہ سوم نوکریاں

۱۶۔ کیا آپ نیچے لکھے ہوئے مقابلے کے امتحانوں میں سوالوں کے جواب دینے کے ذریعے کے بارے میں سرکار کی موجودہ ہدایتوں میں کوئی ترمیم ضروری سمجھتے ہیں؟

(الف) سپارڈی نیٹ گزیٹڈ اور ریاستی نوکریاں۔

(ب) دفتری (Ministerial) اور دوسری غیر گزیٹڈ نوکریاں، اگر جواب ہاں ہے تو براہ مہربانی اپنے خاص سجھاؤ دیجئے۔

حصہ چہارم اُردو کی ترقی

۱۷۔ کیا اردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے ریاست کی طرف سے امداد کے بارے میں آپ کو کوئی سجھاؤ دینا ہے؟

حصہ پنجم عام

۱۸۔ کیا اور بھی ایسی باتیں ہیں جن کو آپ بھاشا کمیٹی کے وچار کے لئے بیان کرنا چاہتے ہیں؟

نوٹ:۔ براہ مہربانی اس سوال نامہ کے جواب میں سجھاؤ دیتے وقت مالی پہلو کو بھی دھیان میں رکھا جائے۔

میونسپل اسکولوں میں اُردو کی تعلیم دی جائے گی

۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء کو الہ آباد کارپوریشن نے فیصلہ کیا کہ میونسپلٹی کے پرائمری اور جونیر ہائی اسکولوں میں اُردو کی تعلیم دی جائے۔

یہ فیصلہ ریاستی حکومت کی ہدایت پر کیا گیا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ریاستی حکومت نے کارپوریشن کو ایک سرکلر کے ذریعہ ہدایت کی تھی کہ ان طلبہ کو اردو کی تعلیم دینے کا بندوبست کردیا جائے جو اُردو پڑھنا چاہتے ہوں۔

ریاستی حکومت کے اس سرکلر پر کارپوریشن کے جلسہ میں غور ہوا جس کے بعد اسے عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کیا گیا۔

انجمن ترقی اُردو دہلی کی ادبی نشست

۲۵ر جولائی کی شام کو انجمن ترقی اردو شاخ دلی کی ادبی نشست میں سمپوزیم ہوا موضوع تھا " ۴۷ء ۱۹ کے بعد اردو کا مستقبل تاریک ہے یا روشن ؟" ـــــ نشست کی صدارت پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب نے فرمائی، جناب گوپال متل، جناب ہنس راج رہبر، جناب عبداللطیف اعظمی اور جناب مولانا بیابانی صاحب حیدرآبادی نے حصّہ لیا۔

گوپال متل صاحب نے کہا۔ پہلے ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اُردو ہے کیا ؟ یہاں کی مقامی زبان جو تھی اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ آگئے اس کا نام اُردو رکھا گیا۔ جب تک ہمیں باہمی ربط کی ضرورت محسوس ہوگی اور اردو ہمارا ذریعہ ربط بنا رہے گا اس وقت تک اُردو کا مستقبل روشن رہے گا۔

چونکہ اُردو کو مذہب اور فارسی سے وابستہ کرلیا گیا اس لئے ہندی سے اس کی رقابت ہوگئی لیکن اب دن بہ دن اُردو کو آسان بنایا جارہا ہے اس لئے آئندہ اس کی ترقی کی راہ میں مشکلات نہیں ہوں گی۔

ہنس راج رہبر نے کہا۔ ہندی اور اُردو کے جھگڑے محض تعصب کی بنا پر ہوئے ورنہ کھڑی بولی اور اُردو کی گرامر ایک تھی۔ اردو کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس کو عوامی رنگ دیا جائے، چونکہ فارسی کے الفاظ اُردو میں مستعمل ہیں اس لئے اس سے تعصب برتا جاتا ہے۔ اگر اُردو والوں کو اس کے مستقبل کو روشن کرنا ہے تو زبان کو آسان بنانا ہی ہوگا۔

عبداللطیف اعظمی نے کہا کہ فاضل مقررین نے اپنی تقریروں میں "اُردو کا مستقبل تاریک ہے یا روشن" اس پر روشنی نہیں ڈالی صرف زبان کی تعریف میں ہی کہا ہے۔

گوپال متل صاحب نے کہا " میری اور رہبر صاحب کی رائے یہ ہے کہ اردو کا مستقبل ۱۹۴۷ء کے بعد تاریک نہیں ہے، اس لئے کہ اُردو کی خوبی یہ ہے کہ اس میں کم سے کم الفاظ میں بات کہی جاسکتی ہے "

عبداللطیف اعظمی صاحب نے کہا مجھے آپ کی رائے سے اختلاف ہے۔ علمی اور ادبی کتابیں اب اُردو میں بہت کم نکل رہی ہیں، یہ صورت حالات پنپنے کی نہیں کہی جاسکتی۔

گوپال متل صاحب نے کہا " علمی کتابیں تو یورپ میں بھی بہت کم فروخت ہوتی ہیں "

رہبر صاحب نے کہا " اردو میں علمی کتابیں تو انجمن ترقی اردو بھی نہیں چھاپ سکتی "

جناب مولانا بیابانی صاحب نے کہا " صرف اس لئے اردو کے مستقبل کو تاریک سمجھنا درست نہیں۔ میں مایوس نہیں ہوں، مجھے تو ہر طرح اُردو کا مستقبل روشن نظر آتا ہے، ہندوستان کا کوئی قصبہ اور شہر ایسا نہیں جہاں اردو جاننے والے نہ ہوں۔ آندھرا میں تو اکثریت کے لوگوں نے بھی اپنے بچوں کو اُردو پڑھانے کا فیصلہ کیا ہے، ہمارے صوبے کے گیارہ ضلعوں میں ۴۵۰ اسکول ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اُردو ہے "

شبیر صاحب نے اعتراض کیا " اگر آپ کے ہاں اُردو کے ساتھ اتنا اچھا سلوک ہے تو پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے اُردو کو کیوں نکال دیا گیا "

گوپال متل صاحب نے کہا " وہ غیر قدرتی حالت میں قائم کی گئی تھی اس لئے باقی نہ رہ سکتی تھی "

صاحب صدر نے اپنے فاضلانہ خطبے میں ارشاد فرمایا کہ پہلا سوال یہ ہے کہ جو اصحاب اردو زبان کا مستقبل روشن بنانا چاہتے ہیں وہ اردو کے لئے کتنا کام کرتے ہیں۔ ہندوستانی اکیڈیمی نے اچھی کتابیں اُردو میں چھاپیں وہ نہیں بک سکیں۔ پہلے حیدرآباد اور پنجاب میں اُردو کی کتابیں کافی اچھی تعداد میں فروخت ہوتی تھیں اب ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو اردو علمی کتابوں سے کچھ عرصے بعد محروم ہو جائے گی۔ آج کل جو لوگ بھی اُردو سیکھتے ہیں وہ کاروباری غرض سے سیکھتے ہیں البتہ فلم کی وجہ سے اُردو چل رہی ہے حالانکہ اردو ایک ایسی زبان ہے کہ گجراتی ہو یا مرہٹی۔ بنگالی ہو یا آسامی ایک دوسرے سے بات کرنے کا ذریعہ ہمیشہ اُردو کو بناتے ہیں۔ لیکن موجودہ صورت کچھ ایسی ہوگئی کہ اُردو کے مستقبل کو روشن سمجھنا ممکن نہیں حکومت ہو یا عوام اُردو سے فائدہ تو ہر کوئی اٹھانا چاہتا ہے لیکن اُس کی بقا کا خیال بہت کم لوگوں کو ہے اور چونکہ اُردو والے خود اس سے بے اعتنائی برت رہے ہیں اس لئے حکومت کو اس سلسلے میں کوئی الزام دینا بے جا ہے۔ اگر ہم واقعی اُردو کی ترقی چاہتے ہیں تو اپنی صلاحیت کے مطابق ہم میں سے ہر ایک کو کام کرنا چاہیئے۔ (اسسٹنٹ سکریٹری)

انجمن تعمیر اُردو دلّی کی ہفتہ وار ادبی نشست

انجمن تعمیر اردو دلی کی ہفتہ وار ادبی و تنقیدی نشست ۲۴ر جولائی کو شام کو ۷ بجے اردو ہال اُردو بازار میں منعقد ہوئی۔ شیش چند سکسینہ طالب دہلوی نے صدارت فرمائی۔ گذشتہ نشست کی کارروائی کی منظوری کے بعد تنقیدی پروگرام شروع ہوا۔

پہلے کامل قریشی بجنوری دہلوی نے ایک غزل پیش کی۔ بعض اشعار پر اعتراضات ہوئے اور مفید مشورے دئے گئے۔

اس کے بعد مجھو دیال نے ایک افسانہ پڑھا۔ حاضرین نے کہانی کو سراہا اور کردار نگاری کی تعریف کی۔

بعد ازاں بیرونی مہمان نشتر کانپوری صاحب نے کلام سنایا۔ اختتام پر صاحب صدر جناب طالب نے جملہ مہمانوں کی چائے سے تواضع کی۔ آئندہ انجمن کے ماہانہ طرحی مشاعرے کی صدارت دلی پردیش کانگریس کمیٹی کے صدر شری رجو ہن فرمائیں گے اور "دلی میں اُردو کی حیثیت اور کانگریس" کے عنوان پر تقریر کریں گے۔

(گلزار دہلوی۔ جنرل سکریٹری)

بقیہ

تبرکاتِ غالب

اسی طرح شاعر کی نظر میں پہلا کہا ہوا کلام بعد کے کہے ہوئے کلام سے ہیٹا معلوم ہوتا ہے اور وہ بطور عام اس کو نظری کر دیا کرتا ہے مگر عوام الناس کے پاس وہ محفوظ رہتا ہے جو اس کو نظری نہیں کرتے، اور شاعر کے منتخب کلام کی طرح ان کی زبانوں پر وہ رواں دواں رہتا ہے کیونکہ پسند کرنے والوں کی پسند میں شاعر کے معیار و خیال کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ مبصرانہ نگاہ رکھتے ہیں کہ شعر کو اس کسوٹی پر جانچیں۔ وہ تو صرف اپنی پسند کو دیکھتے ہیں اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ اس قسم کے شعر بھی اگر شاعر سے منسوب نظر آئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں اور پھر ذہنی ارتقائی منزلیں طے کرنے سے پہلے کسی کے کلام میں معیار سے گرے ہوئے اور کمزور اشعار کا پایا جانا یقینی ہے بلکہ معیاری کلام بھی قبل انتخاب شروع سے آخر تک یکساں نہیں ہوتا ایسی صورت میں غالب کے کلام کو ان خطری خصوصیات سے کیونکر مبرا سمجھا سکتا ہے۔ اں واقعہ بھی ناقابل فراموش قرار نہیں پا سکتا کہ بیچارے غالب کے ساتھ بڑی ستم ظریفی کی گئی ہے۔

جلب زر اور خود کو نمایاں کرنے کے پیش نظر ان کے قلم سے منسوب کرکے خود ساختہ نثر و نظم کے پیش کرنے سے بھی لوگ نہیں چوکے۔

مرزا نے ایک خط محررہ ۲۷ر جولائی ۱۸۶۳ء عیسوی میں علاء الدین احمد خاں کو لکھا تھا کہ پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں معروف نے ایک زمین نئی نکالی تھی۔[1] میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ ہے ؎

پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

مقطع یہ ہے ؎

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کرکے غزل بنائی اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے۔" (اردوئے معلی مجتبائی حصہ اول صفحہ ۳۲۸)

چنانچہ اس زمین میں حسب ذیل چھ شعر "باغ سہر" میں موجود ہیں ؎

نہ بوسہ دے تو مجھے میرا دلِ خراب تو دے
دل خراب بھی رہنے دے کچھ جواب تو دے

ہزار بوسے مرے تجھ پہ ہیں نہ دے حساب
تو ایک بوسہ مجھے اور علی الحساب تو دے

اِدھر میں گور میں چپ ہوں بغم جدائی سے
اُدھر یہی کہے ہے فرشتہ مجھے حساب تو دے

پلادے اوک سے ساقی جو تجھکو نفرت ہے[2]
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

گھر اس کا دور ہے اور پاؤں میں نہیں طاقت
فلک زمیں کی ذرا کھینچ تو طناب تو دے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
جو اس نے ہنس کے کہا میرے پاؤں داب تو دے[3]

اب نہیں کہا جا سکتا کہ اوپر بتائے ہوئے دو شعروں کے ساتھ جو شعر منقول ہوئے وہ غالب کے ہیں یا بالفاظِ غالب "کسی اُلّو کے"۔ مگر ناممکن یہ بھی نہیں کہ مرزا نے ان کو موزوں کیا ہو اور پھر باقتضائے طبیعت نظری کر دیا ہو کیونکہ ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ غالب کے مشارٌ الیہ اشعار یہی ہیں۔

مرزا کی تصانیف میں منظوم ایک کتاب اور ہے جس کا نہ تو تصانیف کے سلسلے میں کہیں ذکر آیا اور نہ یہ کسی مجموعۂ کلام میں شامل نظر آئی۔ اس کی نشاندہی غالب کے شاگرد رشید مولانا محمد عباس رفعت بھوپالی نے علم اللغات پر مشتمل اپنی ایک اردو کی مطبوعہ مثنوی کے آخر میں بزبان فارسی بدیں الفاظ کی ہے ؎

از کرمہائے الٰہی رفعتا • ختم شد عباس نامہ مرحبا
از کلامِ حضرتِ استادِ من • غالبِ سحر البیاں جادو سخن
ہست ہا ایں نہج قادر نامہ نظم • من تتبع کردہ ام اے نورِ چشم
زاں کلام و ایں کلامم یاد گیر • ہر دو را انگار تنگ شہد و شیر

قادر نامہ کسی زمانے میں بہت مشہور اور کتب درسی کے سلسلے میں داخل تھا۔ یہ خالق باری کے طرز پر لکھا گیا ہے جس کے ازبر کر لینے سے طلبہ کو صدہا لغات یاد ہو جایا کرتے تھے اسی ضرورت کے پیش نظر جیسا کہ رفعت کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے، غالب نے اس کی تدوین کی اور رفعت نے عباس نامہ بھی بہ تقلید استاد اسی نہج پر مرتب کیا۔

مشہور و متداول ہوتے ہوئے بھی شاید یہ کسی کے علم میں نہ ہو گا کہ قادر نامہ کے مصنف مرزا غالب ہیں اور غالباً یہی وجہ ہے کہ یہ معرض اظہار میں نہیں آیا۔

---

[1] گویا اس زمین کی غزل ۱۸۱۳ء کے لگ بھگ کی ہے۔ اس وقت غالب کی عمر کچھ اوپر سترہ سال کی ہو گی۔ غزل کا مقطع بھی اسی عمر کی غمازی کر رہا ہے۔

[2] پہلے مصرعے کا آخری ٹکڑا نسخۂ مرتبہ وحیدہ بیگم میں "جو ہم سے نفرت ہے" درج ہے اور یہی صحیح ہے کہ منقولۂ بالا خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

[3] "جو اس نے ہنس کے کہا" کے بجائے "کہا جو اس نے ذرا" پیش نظر دواوین میں درج ہے جو بلحاظ مکتوب مولانا صحیح ہے۔

پبلشر نذیر حسن پرنٹر نصیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن سے شائع کیا

تبصرے

وحید اختر

مقام غالب: غالب تنقید اور تحقیق کرنے والوں کے لئے پچھلی ایک صدی سے پسندیدہ موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اردو کے دو ہی شاعر ایسے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ غالب اور اقبال ــــ پچھلے چند برسوں میں محققین نے غالب کی زندگی اور کلام کے ہر گوشے پر مختلف پہلوؤں سے بڑا کام کیا ہے۔ زیرِ نظر تصنیف مبارز الدین رفعت کی ہے جو اردو کے ان چند خاموش خدمت گذاروں میں سے ہیں جو نمود و نمائش سے بے نیاز علمی کام کرتے رہتے ہیں۔ رفعت صاحب اب تک کئی کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں تالیفات و تراجم کے علاوہ ان کی اپنی طبعزاد کتابیں بھی شامل ہیں۔

غالب پر اب تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے بیشتر محققانہ انداز کی ہیں۔ غالب کو سمجھنے کے لئے ایک حد تک تو یہ مسائل اہم ہیں کہ غالب کے سوانح حیات اور ان کے کلام کی تاریخی ترتیب کو محقق کی نظر سے دیکھا اور ترتیب دیا جائے لیکن کسی شاعر کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے یہی سب کچھ نہیں۔ غالب پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود اس لحاظ سے بہت کم لکھا گیا ہے۔ جہاں تنقید ہے وہاں محققانہ شان نہیں اور جہاں تحقیق کا رکھ رکھاؤ ہے وہاں تنقیدِ شعر کے آداب نظر ہی نہیں۔

مقام غالب کے مصنف نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کو ایک ہی کتاب میں ساتھ ساتھ پیش کیا جائے۔ مقام غالب نہ تو محققانہ تصنیف ہے نہ خالص تنقیدی بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایسی کتاب لکھی گئی ہے جو طلبہ اور عام ادیبوں کو غالب کے مطالعے میں ابتدائی معلومات بہم پہنچا سکتی ہے اور اب تک جو کچھ غالب پر لکھا گیا ہے وہ سارا سرمایہ نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، سوانح حیات، فارسی نظم و نثر، اردو شاعری کا انتخاب، اردو نثر، غالب پر لکھی ہوئی کتابیں۔ اس طرح ۱۰۰ صفحات میں وہ سارا مستند مواد یکجا کر دیا گیا ہے جو اب تک غالب کے سلسلے میں فراہم ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں طلبہ کو بڑی بڑی ضخیم اور قیمتی کتابوں کا خلاصہ بھی مل جائے گا اور ان کا اجمالی خاکہ بھی۔ یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن نے شائع کی ہے اور دو روپے میں مل سکتی ہے۔

دھرتی کا کال: مجموعہ ہے جوگندر پال کے افسانوں کا جسے حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی نے شائع کیا ہے۔ کتابت طباعت صاف ستھری ہے، قیمت دو روپے آٹھ آنے ہے۔

جوگندر پال بارہ برس سے افریقہ میں ہیں۔ تلاش معاش کے اس طویل بن باس میں انھوں نے افریقہ کو بہت قریب سے دیکھا اس کی دھڑکنوں کو محسوس کیا اور اس کے عوام کے دکھ درد کو سمجھا ہے اسی لئے ان کے افسانوں میں آج کا جیتا جاگتا افریقہ ملتا ہے۔ ہمارے افسانوی ادب میں ایسے افسانوں اور افسانہ نگاروں کی کمی نہیں جنھوں نے سیاسی موضوعات کے سہارے دنیا کے ہر اس ملک اور اس کی سیاست کے اطراف افسانوں کے تانے بانے بنے ہیں جس کا آزادی اور بیداری کی تحریک سے تعلق رہا ہے۔ لیکن پڑھنے والا بہت آسانی سے محسوس کر سکتا ہے کہ کہاں جذباتیت نے صرف سطح کو چھوا ہے اور کہاں وہ کسی حد تک گہرائی میں اتر سکی ہے۔ عام طور پر اس انداز کے افسانوں کا ادبی مقام معتبر و مستند نہیں۔ خبریں پڑھ کر، تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کی مدد سے کسی ملک اور اس کے رہنے بسنے والوں کے متعلق معلومات تو اکٹھی کی جا سکتی ہیں لیکن بلند پایہ فنی تخلیق کا امکان نہیں اس لئے کہ فن کی تخلیق محض معلومات نہیں چاہتی بلکہ مشاہدے کی باریکی اور جذبہ کی ہمہ گیری بھی مانگتی ہے اور یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسی ملک کے کلچر، تاریخ اور معاصر فضا کو اپنی دھڑکنوں سے ہم آہنگ نہ کر لیا جائے۔ جوگندر پال نے افریقہ کو ایک ہندوستانی کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ انھوں نے افریقہ کو وہیں کے ایک باشندے کی حیثیت سے دیکھا، محسوس کیا اور برتا ہے۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں ہم کو تصنع اور سطحیت کی جگہ ایک سنبھلی ہوئی اور مانوس فضا ملتی ہے۔

اس مجموعے کے تمام افسانے افریقہ کے موجودہ کرداروں کو پیش کرتے ہیں۔ صدیوں کے استحصال سے کچلے ہوئے غریب لوگ جنھیں علم کی دولت سے محروم رکھا گیا ہے، جو صرف اس لئے نفرت و حقارت کے مستوجب رہے کہ ان کی جلد کا رنگ سفید نہیں، جو اپنے وطن میں پردیسیوں کی غلامی کرتے رہے۔ آج یہ افریقہ جاگ رہا ہے، کئی ممالک آزاد ہو چکے ہیں اور کئی آزادی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ "دھرتی کا کال" کے تمام افسانوں میں اس نئے افریقہ کی زندگی ملتی ہے اور ان کرداروں سے ملتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی دوسرے ہی جیسے انسان سے مل رہے ہیں اور اس کے دکھ درد کو محسوس کر رہے ہیں۔

تعارف کرشن چندر نے لکھا ہے اور اختتامیہ دیوندر ستیارتھی نے۔ دیوندر ستیارتھی کا مضمون "جامبو، جوگندر پال" اس مجموعے اور صاحب مجموعہ کو سمجھنے میں زیادہ مدد دیتا ہے اس لئے کہ رسمی انداز کے تعارف سے دامن بچا کر لکھا گیا ہے اور افسانوں کا صحیح تجزیہ ہے۔ اس مجموعے سے اردو تہذیب کی انسان پرستی کی روایات کو بھی سہارا ملتا ہے اور ان پڑھنے والوں کو بھی ڈھارس بندھتی ہے جو یہ سننا چاہتے ہیں کہ ابھی اردو افسانے کا سفر ختم نہیں ہوا۔ اس کارواں میں اب بھی ایسے نئے اور تازہ دم مسافر شریک ہو رہے ہیں جنھوں نے دیس دیس کی خاک چھانی ہے اور جو اپنی آنکھوں میں ان خوابوں کا سرمایہ سمیٹے ہوئے ہیں جو لٹ بھی جاتے ہیں، قتل بھی ہو جاتے ہیں مگر رخ فردا کی دید کے لئے آنکھیں بچھائے رہتے ہیں۔

جوگندر پال، آزادی کے بعد نمایاں ہونے والوں افسانہ نویسوں میں اپنے موضوعات اور انداز کے لحاظ سے منفرد ہیں، "دھرتی کا کال" ان کا پہلا مجموعہ ہے، لیکن ان کی اٹھان شاندار ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ اگر انھوں نے فکر و نظر کی دیانت کے ساتھ فن کے آداب کو بھی ملحوظ رکھا تو ہمارے افسانوی سرمائے میں قابل قدر اضافہ کر سکیں گے۔